Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخری دنوں کا زمانہ تھا اور ہمارا ملک ایک نازک دور سے گزر رہا تھا۔ جب چائے کے وقت پر ایاز سے میری بات ہوئی تو میں نے ان خطرات کی جانب اشارہ کیا۔ "اسی وقت میں تو ایسے مضمون کی ضرورت ہے۔" ایاز جوش سے بولا، "پہلے میں نے کیوں اس موضوع پہ نہیں لکھا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کسی گورنمنٹ ایجنسی پر یا حکومت کی پالیسیوں پر براہِ راست کوئی حملہ نہیں کیا۔ ہاں، بین السطور جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کا نوٹس اگر لیا جاتا ہے تو بسم اللہ۔ یہی میرا مقصد ہے۔ تم ذرا اس کا اردو میں ترجمہ کر دو۔"

میں نے نسیم کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے شوہر کو اس سلسلے میں کوئی غیر محتاط قدم اٹھانے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی۔ مگر نسیم خاموش رہی۔ میں نے تین دن لگا کر بڑی محنت سے اس مضمون کا ترجمہ کیا۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد یہ مضمون ایک ہی روز کے انگریزی اور اردو اخباروں میں چھپ گیا۔ جو خوشی مجھے یہ تحریر پڑھ کر ہوئی اس کا مقابلہ میں صرف اس خوشی سے کر سکتا ہوں جو مجھ کو اپنی پہلی چھپی ہوئی کہانی دیکھ کر ہوئی تھی۔ میں نے دونوں اخباروں میں سے تراشے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیے۔ (یہ تراشے آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔) اگلی ملاقات پر ایاز نے مجھے بتایا کہ خلافِ امید، سرکار میں اس کی پیشی ہو گئی تھی۔ چیف سیکرٹری نے اسے بلا بھیجا تھا۔ پھر اس ملاقات کے چند روز کے بعد گورنمنٹ ہاؤس کی ایک تقریب میں اسے مدعو کیا گیا جہاں پر گورنر نے، جس سے ایاز کی پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، اسے اس طرح مخاطب کیا جیسے اس کو ذاتی طور پر جانتا ہو، اور چلتے چلتے دو ایک باتیں کرتا گیا تھا۔ ان دونوں ملاقاتوں میں ایاز کو نہ کوئی سرزنش کی گئی نہ کسی کام سے روکا گیا۔ صرف اتنا کہا گیا کہ گورنمنٹ یہ توقع رکھتی ہے کہ ملک کے ذہین لوگ اپنے "ٹیلنٹ" کو مثبت کاموں میں صرف کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایاز نے کچھ عرصے تک اخباروں میں لکھنا بند کر دیا۔ (یا اخباروں نے اس سے کنارہ کشی کر لی۔) مگر اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت کے بعد سے اس کے کام کی نوعیت یکسر بدل گئی۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں اس سے ملنے گیا ہوا تھا کہ اس کے گھر پر ہی، اس بات پر بحث کرتے کرتے ایاز اور اس کے سسر کے درمیان اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا تھا۔ ایاز کی پریکٹس کا رنگ تیزی سے بدلتا جا رہا تھا۔ اس کے جونیئر وکیل اس کے وفادار تھے، اور جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا اس کی پریکٹس چلاتے جا رہے تھے۔ مگر ایاز کی آمدنی میں کمی ہو گئی تھی، اور بے حیثیت لوگوں سے اس کی طرف داری ایک جذبے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

"ڈیڈی۔" میرے سامنے نسیم نے جوش میں آکر اپنے باپ سے کہا تھا، "ایاز کے لیے یہ پرنسپل کا معاملہ ہے۔"

"پرنسپل۔ پرنسپل۔" نسیم کے باپ نے ناراضگی سے جواب دیا تھا، "آپ لوگوں کو پتا بھی ہے پرنسپل کیا ہوتا ہے؟ ہم لوگوں نے بھی ملک کی خدمت کی ہے۔ جن لوگوں نے یہ ملک بنایا تھا وہ ہمارے پروفیشن کے لوگ تھے۔ خدا کے بندے تم نے عمر بھر میں ایک ٹریننگ حاصل کی ہے۔ دماغی ڈسپلن سیکھا ہے۔ جو کام بھی کرو ڈھنگ سے کرو، اپنے ڈسپلن کی مدد سے کرو۔ یہ کیا کہ میونسپل کمیٹی کے ممبر کی طرح جو بھی آیا اسی کے ساتھ اٹھ کر کورٹ میں جا پہنچے۔ تم نے کس کا ووٹ لینا ہے....."

"بہرحال ڈیڈی آپ ایاز کے کام میں دخل نہ دیں۔" نسیم نے غصے میں آکر بات ختم کر دی تھی۔

میرے علم میں یہ پہلا موقع تھا کہ نسیم نے کسی بات میں اپنے باپ کے مقابل ایاز کی حمایت کی تھی۔ دو چار مہینے ایسے آئے جبکہ مجھے خود بھی یہ ڈر پیدا ہونے لگا کہ ایاز اپنے جوش و خروش میں شاید اپنا نظم و ضبط ہاتھ سے کھو بیٹھا ہے۔ اوپر نیچے اس نے کئی مقدمے معمولی فیس پر لیے، لڑے اور جیتے۔ ایک بار اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ اسے گورنر کی طرف سے ایک پیغام ملا ہے۔

"بوجھو کیا؟" وہ مسکرا کر ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا ؟" میں نے پوچھا۔

"اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے کی پیش کش ہوئی ہے۔"

"پھر ؟" میں نے سانس روک کر سوال کیا۔

"ہا ہا۔" اس نے قہقہہ لگایا، "آگئے نا تم بھی دھوکے میں۔ بھائی یہ رشوت دی جا رہی ہے۔ میں آتا ہوں ان جھڑدوں کے چکر میں ؟"

ان دنوں میں ایاز کی جذباتی حالت کچھ ایسی تھی کہ کبھی کبھی مجھ کو وہ ایک اجنبی کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ میرے لیے ایاز ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی زندگی کو اپنی ذہانت کے خطوط پہ وضع کیا تھا، جس نے ہمیشہ اپنے دل کو اپنے دماغ کے نظم و ضبط کے تابع رکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے جذبات کو ابھرنے کا موقع دیا تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جذبات اس کی عقل پہ قبضہ جماتے جا رہے ہیں۔ تاہم، یہ بات نہیں تھی کہ کسی صورت میں اس کا ذہن کند پڑ گیا تھا۔ بلکہ جس سمت میں وہ چلا جا رہا تھا اس سمت میں اس کا دماغ پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور تندی کے ساتھ کام کرنے لگا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا ذہن "ثانیہ" ایک بے نام سے مقام پہ رک کر، اپنے آس پاس ایک حیران و پریشان نظر ڈال کر، ایک دھچکے سے نئی منزل کی جانب دوڑ پڑا تھا۔ اس وقت کے دوران ایاز کی سب سے بڑی خوش قسمتی نسیم کا ساتھ تھا۔ اس نازک دور میں جب اس کا دوست اظہر، اس کا سسر، اس کے پیشہ ور دوست اور کئی ملنے والے اس سے کنی کترانے لگے تھے، ایاز کی بیوی ایک چٹان کی مانند جم کر اس کے ساتھ کھڑی رہی تھی۔ اس نے کبھی کسی مسئلے پہ ایاز سے کوئی بحث یا تکرار نہ کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پہلی بار مکمل طور پہ وہ اپنے شوہر کی زندگی میں شریک ہو رہی تھی۔ اب بھی میری رائے ہے کہ یہ نسیم کی ثابت قدمی کا نتیجہ ہی تھا کہ آخرِ کار ایاز کا رویہ آہستہ آہستہ کسی ڈھرے پہ آنے لگا۔ سال بھر کی ہل چل کے بعد ایاز کے اندر کی تحریک دھیمی پڑنے لگی، جیسے اس کی طبیعت اس غیر فطری رفتار کو رد کر کے اپنے پرانے ضبط اور ترتیب کے دائرے کے اندر لوٹ رہی ہو، یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے اس نے اپنی اصل سمت آخرِ کار ڈھونڈ نکالی ہو۔ اس کا جذبہ اسی طور قائم رہا، صرف اس میں ایک دیرپا قوتِ ارادی کی شکل اور ترتیب پیدا ہو گئی۔ ایاز نے اپنی پریکٹس کو اب گویا دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طرف تو وہ ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے مقدمے لیتا اور ان کی فیس وصول کرتا تھا۔ دوسری جانب وہ اتنا وقت اپنے ہاتھ میں بچا کر ضرور رکھتا کہ اپنی مرضی کا کوئی مقدمہ، معاوضے کا خیال کیے بغیر لڑ سکے۔ اپنے سسرال کے لوگوں سے ایاز کے تعلقات دوبارہ استوار ہو چکے تھے، اور نسیم اتنی خوش نظر آنے لگی تھی کہ میں نے اس سے پہلے اس کو شاید صرف شادی کے فوراً بعد کے چند مہینوں میں اتنا خوش دیکھا تھا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں کے اندر ایاز نے ہائی کورٹ میں وہ دو مقدمے لڑے جن کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ دفعتہً ایاز کا نام قانونی حلقوں سے نکل کر عوام میں پہنچ گیا۔

اب تک میں نے صرف ان مختلف شکلوں کا ذکر کیا ہے جو شکلیں ایاز کی زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کرتی رہی۔ بعض جگہوں پر میں نے اسے تبدیلی کا نام بھی دیا ہے مگر اب خیال کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذکر محض ان صورتوں کا تھا جنہیں ہر آدمی اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اور عمر کی مختلف منزلوں پر اس کی شخصیت ان صورتوں میں نمودار ہوتی رہتی ہے، گویا ان میں سے ہر ایک کا ایک وقت اور ایک مقام مقرر ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ یا کوئی حادثہ ایسا پیش آئے کہ آدمی کی شخصیت کو ہی بدل کر رکھ دے، اور بعد میں آنے والی تمام صورتوں کی بناوٹ پر اثر انداز ہو۔ بے شک ایسا کم ہوتا ہے، مگر کوئی کوئی آدمی —— یا اس کی زندگی کا کوئی کوئی مقام —— ایسا ضرور ہوتا ہے جس میں اس تبدیلی کے جراثیم پنہاں ہوتے ہیں، اور ان سے بچنا اس کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ان دنوں ایاز کی زندگی میں پیش آیا۔

یہ واقعہ اپنے طور پر ایک الگ کہانی ہے۔ مگر اس کہانی کو بیان کیے بغیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اپنے دوست کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اسے بیان کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب میں ایاز کی زندگی کے ایک واقعے میں پوری طرح شریک ہوا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے اور میں اس بار کوئی دو مہینے کے وقفے کے بعد ایاز سے ملنے کے لیے لاہور گیا تھا۔ اتوار کے روز شام کے وقت ایاز کے چند دوست (وہ لوگ جنھوں نے بیچ میں کچھ عرصے کے لیے ایاز سے کنارہ کشی کر لی تھی، اب دوبارہ اس کی جانب امڈتے آ رہے تھے) اس کے گھر پہ اکٹھے ہوئے۔ گپ شپ رہی، کھانا کھایا گیا، اور پھر ہم سب آتش دان کے گرد دیر تک بیٹھے چلغوزے اور اخروٹ کھاتے اور کافی پیتے رہے۔ ایک بات جو اس روز میں نے محسوس کی وہ ایاز کی غیر معمولی خاموشی تھی۔ گفتگو حسبِ معمول قانون، سیاست، اخبارات اور ملک کے عام حالات کے بارے میں ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی مزے دار قصہ بھی آ جاتا۔ ایاز جو ہمیشہ میزبان کے فرائض انجام دیتا ہوا گفتگو کے ہر موضوع پر پیش پیش رہتا تھا، آج کچھ بے خیالی کی حالت میں تھا۔ آخر جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو ایاز واپس آ کر دوبارہ آتش دان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ٹانگیں لمبی کر کے، کہنیاں کرسی کے بازوؤں پہ اور ہاتھوں کی مٹھیاں ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر جلتی ہوئی لکڑیوں کی آگ کو دیکھنے لگا۔ اس کے ماتھے پر گہرے فکر کی شکنیں تھیں۔ میں کچھ دیر تک نسیم سے باتیں کرتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے ایاز سے پوچھا، "آج تم کچھ چپ چپ ہو۔"

ایاز نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر جواب دینے کی بجائے آہستہ سے ہنس کر خاموش ہو رہا، جیسے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا ہو۔

"ایاز کو ایک مقدمے نے پھنسا رکھا ہے۔" نسیم نے جواب دیا۔

"پھنسا رکھا ہے؟" میں نے دہرا کر پوچھا۔ یہ میرے لیے ایک حیران کن بات تھی۔ قانون ایاز کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ میں نے اس کو عرق ریزی سے مقدمے تیار کرتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو دیکھا تھا، مگر کبھی اسے پریشانی میں مبتلا نہ پایا تھا۔ "کیسا مقدمہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک قتل کا مقدمہ ہے۔" نسیم نے کہا۔

قتل کے مقدمے ایاز کا روزمرہ کا کام تھے، کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر ابھی تک وہ اس بارے میں بات کرنے سے کترا رہا تھا۔ میں نسیم سے بات کر رہا تھا تو وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسی طرح گہرے فکر کی حالت میں ماتھے پہ شکن ڈالے، ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دیے کمرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اِدھر سے اُدھر پھرنے لگا۔ میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آکر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"کوئی مشکل کیس لگتا ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

ایاز آہستہ سے مسکرایا۔ "مشکل تو نہیں۔" وہ بولا، "عجیب سا ہے۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"میں انگلستان میں تھا تو اکثر ایسے کیس دیکھنے میں آتے تھے۔" وہ بولا، "یہاں پہ اصل میں سیدھے سادے معاملوں پہ قتل ہوتے ہیں۔ پرانی دشمنی پہ۔ جائیداد پہ، یا بدچلنی پہ۔" پھر ایک لمحہ رک کر بولا، "ویسے تو یہ معاملہ بھی بدچلنی کا ہے۔"

"قصہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"قصہ یہ ہے کہ ایک پڑھا لکھا نوجوان گزیٹڈ افسر ہے جس نے بدچلنی کے شبہے پر اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ میں ڈِفینڈ کر رہا ہوں۔ ملزم نے اقبالِ جرم کیا ہے، شہادتیں موجود ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ جرم سے انکار نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی میں اس بنیاد پہ ڈیفنڈ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کیس کو صرف diminished responsibility کی بنیاد پہ ڈیفنڈ کیا جا سکتا ہے۔"

"پھر مشکل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مشکل یہ ہے کہ اس میں بدچلنی کا ثبوت مہیا کرنا ضروری ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اور وہ موجود نہیں ؟"

"ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل رہا۔"

"ملزم کیا کہتا ہے ؟"

"اس کی دماغی حالت کچھ واضح نہیں۔ شروع میں اس کا بیان تھا کہ اس نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو اکٹھے پا کر ان پر حملہ کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ پیرا مار دہاں پہ موجود نہیں تھا۔ اس نے محض شبہے کی بنا پہ بیوی کو قتل کیا ہے۔ آدمی گو خاصا ذہین ہے مگر اس واقعے نے اس کے ذہن پہ اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ ڈلفنس کو اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا پڑے گا۔ پراسیکیوشن اس کے سٹینڈ لینے پہ اصرار کر سکتی ہے اور غالباً کرے گی۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہم اسے بلاک کر سکتے ہیں۔ اس وقت اس کی ایک ہی صورت ہے۔"

"کیا صورت ہے ؟"

"ذہنی توازن بگڑنے کی پلی لی جائے۔"

"اس میں کوئی حرج ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے کیس ایک تو پیچیدہ اور کسی حد تک کمزور ہو جاتا ہے۔ دوسرے ڈاکٹروں کی رپورٹوں پہ خاصا انحصار کرنا پڑتا ہے۔"

"ہوں۔" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر تو معاملہ واقعی ٹیڑھا ہے۔"

"یورپ یا امریکہ کی کوئی بھی عدالت اس معاملے میں محض بدحلینی کے شبہے کی بنا پر ذہنی توازن بگڑنے، بلکہ وقتی طور پہ توازن بگڑ جانے کی دلیل کو قبول کرے گی۔" ایاز بولا، "ہمارے ہاں اگرچہ قانون انگریزی طریقے کا ہی چل رہا ہے مگر عدالتیں ابھی ان باریکیوں تک نہیں پہنچیں۔ بہرحال اور بھی طریقے ہیں اسے ہینڈل کرنے کے۔ میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ کس طرف سے اسے اپروچ کیا جائے۔" ایاز چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ "تاہم — جو بات مجھے "بادر" کر رہی ہے"، اس نے زور دے کر کہا، "وہ یہ ہے کہ آدمی بے قصور ہے۔"

"کیا مطلب ؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"انوسنٹ" ایاز اعتماد سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا، گویا اس سے بڑی دلیل اور کوئی نہ ہو۔ "یہ آدمی انوسنٹ ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس بات کا مجھے علم نہیں۔" وہ بولا، "اس سے زیادہ ابھی کسی بات کا مجھے علم نہیں۔ بس میرے دل میں یقین ہے کہ یہ آدمی بے قصور ہے۔ صرف ثابت کرنے کی بات ہے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ ایاز کا دماغ مکمل پہ ایک وکیل کا دماغ تھا۔ اس کے ہاں واہمے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ایاز کے لیے صرف اس بات کا وجود ہوتا تھا جس بات کی دلیل مہیا کی جا سکتی ہو۔ (وہ باتیں جن کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی انہیں تسلیم کرنے کے لیے بھی وہ کوئی دلیل پیدا کر لیتا تھا۔ بعض دفعہ مجھے خیال آتا تھا کہ شاید خدا کا وجود بھی اس کے ذہن کے اندر ایک دلیل کی شکل میں تھا۔) آج تک ایاز نے کبھی اس طرح کی بات نہ کی تھی جو شہادت اور دلیل کے دائرے سے باہر نکلتی ہو، نہ کبھی اس نے حالات و واقعات کو نظر انداز کر کے کسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے وہ ایک اعلیٰ درجے کا بیرسٹر تھا۔ مگر آج — اپنے سارے اصول توڑ کر وہ اتنی لاپروائی سے کہہ رہا تھا، "بس ثابت کرنے کی بات ہے۔" پہلی بار ایاز نے ٹھوس حقائق کی دنیا کو چھوڑ کر واہمے کی ایسی پھسپھسی زمین پہ قدم دھرا تھا جہاں پاؤں دھنستا چلا جاتا ہے مگر خبر نہیں ہوتی۔

میں آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتا رہا۔ وہ دوبارہ منہ پھیر کر آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگا۔ نسیم ہمارے پاس سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ اندر کے کسی کمرے سے اس کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایاز مجھے شروع سے لے کر آخر تک اس کیس کے سارے حالات بتائے۔ یہ کون شخص تھا جس نے اپنی بیوی کا قتل کیا تھا، پھر اس کا اغبال کیا تھا، اور اس کے باوجود ایاز جیسے شخص کو اپنی بے گناہی کا قائل کر چکا تھا۔

ایاز نے میری طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا جیسے اس نے میرے دل کی بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جان لی ہو۔

"تم ایک ادیب ہو۔" وہ بولا، "لوگوں کے دل کا حال جاننے کا دعوے کرتے ہو۔ تم مجھے بتاؤ کہ یہ کیا حقیقت ہے۔"

"میں کسی کے دل کا حال جاننے کا دعوے نہیں کرتا۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "مگر یہ کیس ہے دل چسپ۔ مجھے ساری کہانی سناؤ تو کچھ بتاؤں۔"

ایاز چند لحظوں تک مجھے دیکھتا رہا، جیسے کسی خیال میں ہو۔ پھر اس نے ہونٹ ذرا سے بھینچے، جلتی ہوئی لکڑیوں پر نظر ڈال کر سر کو ایک آدھ بار اثبات میں ہلایا، اور میری جانب متوجہ ہو کر بولا: "تو سنو۔"

اب میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ انہی چند لمحوں کے اندر ایاز نے مجھے اس کیس میں شریک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جو تفصیلات اس نے مجھے بتائیں وہ یہ تھیں: ظفر ایک گاؤں سے تعلق رکھتا تھا۔ پڑھائی میں تیز تھا۔ اس کے گاؤں کے قریب شہر تھا جہاں سے اس نے سکول اور کالج پاس کیا۔ بی۔ اے۔ کرنے کے بعد اسے فوڈ انسپکٹر کی ملازمت مل گئی، مگر ساتھ ہی ساتھ وہ پی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کرتا رہا۔ دو سال کے بعد اس نے مقابلے کا امتحان پاس کر لیا۔ ٹریننگ کے بعد چند قصبوں اور شہروں میں مجسٹریٹ وغیرہ کے عہدے پر اس کی تعیناتی ہوئی۔ ان قصبوں میں ایک قصبہ قصور تھا۔ قصور میں ملازمت کے دوران ایک کلیم کے مقدمے کے سلسلے میں اس کی ملاقات اپنی بیوی کے خاندان سے ہوئی۔ یہ لوگ دلی کے مہاجر تھے اور سن سینتالیس میں قصور آ کر بس گئے تھے۔ ہجرت کے موقعے پر کوثر کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ جب ظفر قصور میں تعینات تھا تو کوثر لاہور کے ایک کالج میں بی۔ اے۔ کے آخری سال میں پڑھ رہی تھی۔ اس نے بی۔ اے۔ پاس کیا تو ظفر سے اس کی شادی ہو گئی۔

ایک دو اور شہروں میں ملازمت کی مدت پوری کرنے کے بعد ظفر کو لاہور سیکرٹریٹ میں تعینات کر دیا گیا۔ واردات کے موقعے پر ان کی شادی کو پانچ سال، اور لاہور میں رہتے ہوئے ایک سال سے کچھ اوپر کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ان کے دو بچے تھے۔ چوبرجی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے قریب ایک پرانی سی کوٹھی کا آدھا حصہ کرائے پر لے کر وہ اس میں رہ رہے تھے۔ وہیں پر ایک روز رات کو نو یا دس بجے ظفر نے کوثر کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایک دو گھنٹے گھر کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنے دونوں بچوں کو سوتے سے جگایا، چار سال کے بیٹے کو سکوٹر پر اپنے پیچھے بٹھایا، اور ایک سال کی بچی کو گود میں لے کر ایک ہاتھ سے سکوٹر چلاتا ہوا اپنے ایک دوست کے گھر جا پہنچا۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت ظفر کے دوست نے پولیس کو اطلاع کر دی۔

یہ چند تفصیلات بتا کر ایاز خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، جیسے اب اس کے پاس اور کوئی بات نہ رہی ہو۔ اس نے صرف اتنا کہا، "چاہو تو اس کی بریف دیکھ سکتے ہو۔"

چنانچہ اس طرح میں اس مقدمے میں الجھا۔ میں نے مقدمے کی بریف اور اس سے متعلقہ تمام کاغذات کا مطالعہ کیا۔ ایاز کے عملے کی اپنی تفتیش قتل کے حالات کے علاوہ صرف ظفر اور اس کی بیوی کی زندگی کے چند واقعات تک محدود تھی۔ مقتولہ کی طالب علمی کی زندگی۔ کالج کی دو ایک لیکچرار، اس کی چند سہیلیوں اور ان کے کنبوں سے رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ قصور میں بھی اِدھر اُدھر سے مقتولہ اور اس کے خاندان کے کچھ جاننے والوں سے پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ ان میں قصور کے ایک بااثر شخص کا بیان بھی شامل تھا جس نے مقتولہ کے کردار کے بارے میں کئی خاص باتوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ ایک بیان ایسا تھا جس کے اوپر کافی حد تک کیس کو کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ اس شخص کی مقتولہ کے ماموں کے ساتھ پرانی دشمنی تھی۔ چنانچہ اس بیان کی اہمیت کو رد کر دینا پڑا۔ ایک مقام پر کالج کے ایک مرد لیکچرار کے ساتھ مقتولہ کے معاشقے کا ذکر بھی تھا، مگر انتہائی کوششوں کے باوجود اس بارے میں کوئی مزید اطلاعات فراہم نہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ چند ایک اور واقعات کا ذکر آیا تھا جن کی اصل اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ بیش تر ایسی باتیں تھیں جو افواہوں اور ذہنی اختراعات پر مبنی ہوتی ہیں اور جنہیں چھوٹے چھوٹے وکیل اکثر اپنے مقدموں میں واقعاتی شہادتوں کو مضبوط بنانے کی خاطر استعمال کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے نہیں ہچکچاتے، مگر ایاز کی سطح پر ان باتوں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ ان کے مقدمے کی بنیاد ابھی تک صرف ظفر کی زندگی کے حالات اور اس کا کردار ہی تھا، گو میرے جیسے غیر پیشہ ور شخص کے لیے بھی یہ بھانپنا دشوار نہ تھا کہ حالات، واقعات، اور اعداد و شمار کے اس ڈھیر میں سے، جو میرے سامنے رکھا ہوا تھا، کوئی خاص سمت یا وزنی دلیل برآمد نہ ہوتی تھی۔

ایک آدھ روز وہاں گزار کر میں واپس اپنے گھر چلا آیا۔ مگر مجھے چین نہ آیا۔ چند دن کے اندر اندر میں نے واپس جانے کی ٹھان لی۔ اس وقت بھی جب ملک بھر کے اندر غالباً سینکڑوں ایسے مقدمے چل رہے تھے جو اس واقعے سے کسی طور بھی مختلف نہ تھے، یہ ایک مقدمہ ایسا تھا جس نے میرے اوپر عجیب و غریب اثر کیا تھا۔ ایاز کی مانند میں کسی تفکر میں مبتلا نہیں ہوا تھا، مگر یوں لگتا تھا جیسے اس نے میرے خیال کے اوپر ایک کمند پھینک دی ہے اور اب اپنی گرفت ڈھیلی کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔ میں نے اپنی بیوی سے بات کی اور اگلے ہی روز واپس لاہور جا پہنچا۔

"میں ظفر سے مل سکتا ہوں؟" گفتگو کے دوران میں نے ایاز سے پوچھا۔

"مشکل ہے۔" ایاز نے کہا، "صرف اس کے وکیل مل سکتے ہیں۔ یا قریبی رشتہ دار۔"

ظفر کے بیان کے کم از کم تین مختلف اقتباسات تھے۔ پہلی رپورٹ میں قطعی طور پر بدچلنی کا الزام تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ ظفر نے اپنی بیوی کو موقعے پر جا لیا تھا۔ مگر پولیس کی تفتیش سے پتا چلتا تھا کہ جس شخص کا نام لیا گیا تھا (کالج کا لیکچرار) وہ عرصہ ایک سال سے ملک سے باہر جا چکا تھا۔ اس بیان سے ظفر کی حیثیت کو خاصی زک پہنچتی تھی۔ پھر عدالتی بیان میں ملزم نے کہا تھا کہ پچھلے کئی ماہ سے اس کی بیوی کی حرکات و سکنات ایسی تھیں جن سے "ظاہر" تھا کہ وہ کسی اور مرد کے ساتھ بدچلنی میں ملوث ہے۔ اکثر وہ گھر سے غائب رہتی تھی اور ہر چند روز کے بعد بچوں کو ساتھ لے کر دو دو ہفتے کے لیے اپنی ماں کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ ایک بار ظفر اس کو واپس لانے کے لیے قصور گیا تو وہ بچوں کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر کہیں اور جا چکی تھی۔ اس کی ماں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو اس کی خبر نہیں تھی۔ چند روز کے بعد اس کی بیوی واپس آئی۔ اس نے اس بارے میں کچھ کہنے سننے سے انکار کر دیا۔ (اس بیان کی تصدیق ان کی ملازمہ نے کی تھی، جسے ایاز اپنے گواہ کے طور پر پیش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔) ایک اور بیان میں جو ظفر نے بعد میں اپنے وکیلوں کے ساتھ بات چیت کے دوران دیا، اس نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ ایک سال کے عرصے سے اسکی بیوی نے اسے ازدواجی حقوق سے محروم کر رکھا تھا، اور یہ کہ اس کی ماں بھی اس "سازش" میں اپنی بیٹی کے ساتھ شریک تھی۔ بنیادی طور پر ظفر کے بیانات میں کوئی تضاد نہ تھا۔ بیوی کی بدچلنی اس کے جرم کی تحریک کا باعث تھی مگر بات پھر وہیں پہ آتی تھی، کہ عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے اس الزام کا ثبوت کیا تھا؟

نسیم نے گھر میں ایک کمرہ میرے لیے تیار کر دیا تھا۔ میں ایک سوٹ کیس میں اپنی چیزیں رکھ کر لمبے قیام کی غرض سے وہاں آوارد ہوا تھا۔ ایاز اور نسیم دونوں میری آمد پہ بہت خوش تھے۔ جب سے وہ اپنے گھر میں آئے تھے ان کا اصرار تھا کہ میں کچھ عرصہ ان کے پاس آکر ٹھہروں۔ مگر میرا اتفاق ایسا ہوا تھا کہ کبھی ایک آدھ روز سے زیادہ قیام کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آخر میں ایک ایسے واقعے کے سلسلے میں ان کے ہاں آکر ٹھہروں گا جو (کم از کم میری نظر میں) ہم تینوں کی زندگیوں میں ایک خاص اہمیت اختیار کرے گا۔ میرے قیام کے پہلے چند دنوں میں ایک نئی بات میرے دیکھنے میں آئی۔ میں نے محسوس کیا میری طرح نسیم بھی آخر ایک تماشائی کی حیثیت سے ہٹ کر اس قصے میں گہری دلچسپی لینے لگی تھی۔ مگر جہاں ایاز کا رویہ قانونی اور میرا خالصتاً تجسسی تھا، نسیم کا رویہ شروع میں کافی دیر تک کچھ غیر یقینی سا رہا۔ ایک طرف تو اپنے شوہر سے اس کی قدرتی وفاداری کا معاملہ تھا، جس کے نتیجے کے طور پر اسکی ہمدردیاں ظفر کے ساتھ تھیں۔ دوسری جانب اس کا جذباتی ردِ عمل تھا، جس کی رو سے ایک ایسا شخص جو بیوی کا قاتل ہو کسی ہمدردی کا حق دار نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم تینوں اکثر رات کے کھانے کے بعد باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اس مقدمے کا ذکر بھی کرتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ تر گفتگو میرے اور نسیم کے درمیان رہتی۔ ایاز گو اب اپنے فکر و تردّد کے دور سے نکل چکا تھا، مگر جہاں تک اس مقدمے کا تعلق تھا اس کی چپ ابھی نہ ٹوٹی تھی۔ چند روز کے قیام کے بعد میں نے سفر پہ نکلنے کا ارادہ کر لیا۔

دراصل پہلے چند روز میں اسی سوچ میں رہا تھا کہ اس قصّے پہ کس جانب سے ہاتھ ڈالوں۔ وکیل چاہے کتنا ہی باوسیلہ کیوں نہ ہو عموماً اپنے سامنے کے واقعات، اور ان سے لگتے ہوئے حالات کو اکٹھا کرتا ہے اور پھر اپنی قانونی صلاحیت کے برابر دلائل پیدا کر کے مقدمہ لڑتا ہے۔ بہت کم وکیل ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعت کا جھکاؤ ان کو مقدمے کے پس منظر کی گہرائیوں یا اس کے کرداروں کی ذاتی زندگیوں میں الجھنے پہ مجبور کرتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی زندگیاں ایک ایسی نیم تاریک، دلدلی سرزمین ہوتی ہے جس کے سراغ کے لیے وقت اور محنت دونوں درکار ہوتے ہیں۔ میرا سروکار اس مقدمے سے اس حد تک تو ضرور تھا کہ ایاز نے مجھے اس کے کھوج کی دعوت دی تھی، مگر ذاتی طور پہ میری دلچسپی اس واقعے کے ڈرامائی عنصر کے ساتھ تھی۔ جرم اور اس کے بڑے کردار ظفر کے بارے میں سامنے کی تمام باتیں مجھے ایاز کے دفتر سے حاصل ہو چکی تھیں۔ ان کو مزید آگے بڑھانے سے کوئی مقصد حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تین چار روز کے غور کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کھوج کی اصل سمت جرم کی واردات سے لے کر ظفر تک نہیں، بلکہ ظفر کی ذات سے شروع ہو کر جرم تک ہونی چاہیے۔ ظفر کی ذات میرا نقطۂ ابتدا تھی۔ یہ شخص کون تھا۔ کس قسم کے مزاج اور کیسی شخصیت کا مالک تھا۔ کیا اس شخص کے لیے یہ جرم ایک فطری عمل تھا یا حادثاتی؟ عجیب بات تھی کہ میں ادھر ادھر سے معلومات اکٹھی کر کے جس شخصیت کی تعمیر کرنے کو چلا تھا وہ آدمی اسی شہر میں مجھ سے کچھ فاصلے پہ قید تھا اور میں اس سے مل نہیں سکتا تھا۔

آخر میں اس نتیجے پہ پہنچا تھا کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ میں خود اٹھوں اور اپنے پاؤں پر چل پھر کر معلومات اکٹھی کروں۔ چنانچہ میں نے اٹیچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیس میں چند چیزیں ڈالیں اور نکل کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے میں نے ایک ایک دو دو دن ان تین چار شہروں میں گزارے جہاں ظفر فوڈ انسپکٹر، اور بعد میں مجسٹریٹ کی حیثیت سے تعینات رہا تھا۔ چونکہ یہ کام ذرا نازک تھا اور میں زیادہ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اپنا شہری لباس ترک کر کے تہہ بند باندھ لیا اور اپنے اوپر کمبل لپیٹ لیا۔ اپنے گھر میں گو یہ میرا روزمرہ کا لباس تھا، مگر میں نے آج تک اس لباس میں دوسرے شہروں کا سفر نہیں کیا تھا۔ (سفر کے لیے میں اکثر پتلون کوٹ یا شیروانی پہنا کرتا ہوں۔) جب میں نے اپنے دیہاتی لباس میں ریل گاڑی کا، بس کا، اور ناواقف شہروں کا سفر کیا تو شروع شروع میں میں نے اپنے آپ کو بہروپیا سا محسوس کیا۔ مگر ایک آدھ روز کے بعد یہ احساس خود بخود رفع ہو گیا۔ میں ذہن میں کوئی خاص تدبیر لے کر گھر سے نہ نکلا تھا۔ چنانچہ جیسے بھی ہو سکا میں موقع محل کے مطابق کام چلاتا رہا۔ زیادہ تر میں نے کچہریوں اور دفتروں میں پھر پھرا کر معلومات حاصل کیں۔ میں نے اپنا تعلق دفتروں کے چپراسیوں سے لے کر منشیوں، کلرکوں اور دوسرے نچلے درجے کے اہل کاروں تک رکھا۔ اپنے شہر میں جس طرز کی میری زندگی بسر ہو رہی تھی اس کے دوران ایسے لوگوں سے بات چیت کرنے کا وصف میرے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ بات شروع کرنے کے لیے کئی جگہ پر میں نے اپنے آپ کو کسی قریبی گاؤں کا دیہاتی ظاہر کر کے ظفر علی چوہان مجسٹریٹ کا پتا پوچھا۔ لوگوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بتایا کہ چوہان صاحب تو عرصہ ہوا بدل کر سیالکوٹ جا چکے ہیں۔ اس وقت تک اس قتل کی مختصر سی ابتدائی رپورٹ کے علاوہ اور کچھ اخباروں میں نہ آیا تھا، چنانچہ زیادہ تر لوگ اس واقعے سے بے خبر تھے۔ سیالکوٹ سے پتا چلا کہ چوہان صاحب پیچھے وطنی تبدیل ہو کر جا چکے ہیں۔ کئی لوگ جو دفتروں اور کچہریوں کے چھپے ہوئے تھے کچھ بتانے سے پہلے سوال جواب کرنے لگے۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کیوں پوچھ رہا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں کو دوسروں سے پیسے بٹورتے ہوئے اتنی عمر ہو جاتی ہے کہ کسی اجنبی کو دیکھ کر سب سے پہلا خیال جو ان کے دل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے کیا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ مجھے مختلف قسم کے بہانے بنانے پڑے۔ مثلاً ایک موقعے پہ میں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے مجسٹریٹ صاحب میرے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے ہمارے گاؤں میں آئے تھے اور اس موقعے پر انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کسی قسم کا کام پڑے تو میں ان کے پاس چلا آؤں۔ یہ بات کر کے میں پھنس گیا، کیونکہ سب جانتے تھے کہ چوہان صاحب کبھی کسی کے گھر دعوت پہ نہیں جاتے اور نہ ہی سفارش مان کر کسی کا کام کرتے ہیں۔ وہاں پر اس ایک جھوٹ سے نکلنے کے لیے مجھے کئی اور جھوٹ بولنے پڑے۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں ایسی من گھڑت باتیں لوگوں سے کہہ رہا تھا، اور کئی بار یہ سوچ کر میرا دل برا ہوا کہ میں جھوٹ بول کر اپنا کام نکال رہا ہوں۔ مگر دو چار دن گزر جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دروغ گوئی کا یہ احساس دبتا جا رہا ہے۔ دراصل اب میں اپنے سراغرسانی کے کام سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ غالباً ہر ایک ادیب کے اندر ایک سراغرساں اور ایک دروغ گو چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنی من گھڑت باتیں اتنی سنجیدگی کے ساتھ لوگوں کے سامنے سچائی کا نام دے کر پیش کرتا ہے۔ اور شاید اسی لیے ادیب کا کام اتنا پُرخطر بھی ہوتا ہے، کیونکہ جب وہ سچائی کی کوئی اصل صورت نہیں نکال سکتا تو محض ایک دروغ گو سراغرساں بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ خیال کر کے میرا دل لرز اٹھتا تھا کہ دنیا پہلے ہی ایسے خطرناک لوگوں سے بھری پڑی تھی۔

ظفر جب فوڈ انسپکٹر تھا تو شہر کے بازار میں ایک چوبارہ کرائے پہ لے کر رہا کرتا تھا۔ مجسٹریٹی کے زمانے میں وہ ایک شہر کے محلے میں مکان لے کر اور دوسری جگہوں پہ سول لائنز کی کوٹھیوں میں رہتا رہا تھا۔ ان رہائش گاہوں کے آس پاس کے دکانداروں اور ملازموں سے باتوں باتوں میں کچھ خبریں ملیں۔ مگر جس شخص کی میں کھوج میں تھا اس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ گیارہ دن کی دوڑ دھوپ کے بعد جب میں واپس لاہور پہنچا تو میری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا تھا۔ جس شخص سے میری واقفیت ہوئی تھی وہ شخص سرکاری افسر ظفر علی چوہان تھا۔ یہ شخص اس قدر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیانت دار تھا کہ جب وہ محکمہ خوراک جیسے بدنام شعبے میں کام کرتا تھا اس وقت بھی لوگ اس کی قسم کھاتے تھے۔ مجسٹریٹ کی حیثیت سے وہ ایک انتہائی محنتی، ذہین اور اصول پسند افسر کے طور پر مشہور تھا۔ اس کے تمام سابقہ ماتحت اور گھریلو ملازم اس سے اور اس کی بیگم سے بے حد خوش رہے تھے۔ ان میں سے جو بڑی عمر کے تھے ان کے منہ سے اس کے لیے دعائیں نکلتی ہوئی میں نے خود سنی تھیں۔ اس کی بیوی اپنی خدا ترسی کے لیے مشہور تھی۔ جہاں جہاں بھی وہ رہی تھی وہاں سے مجھے یہی خبر ملی کہ اس کے گھر سے کوئی خالی ہاتھ نہ نکلتا تھا، پیسہ اس کے ہاتھ میں پانی کی طرح بہتا تھا، اور اس نے کبھی کسی کو اونچی آواز سے ڈانٹا تک نہ تھا۔ ظفر اس کا بے حد خیال کرتا تھا، اور دونوں آپس میں بڑے پیار محبت سے رہتے تھے۔ ظفر جہاں سے بھی تبدیل ہو کر گیا بہترین رپورٹ لے کر گیا تھا۔ البتہ ایک بات میرے علم میں آئی جو کسی حد تک خلافِ معمول تھی۔ ان کا ملنا ملانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ظفر کا ایک ہی حال تھا۔ وہ کبھی کسی کلب وغیرہ میں شامل نہ ہوا تھا۔ جس شہر میں وہ لگا ہوتا تھا وہاں کے کچھ باعزت لوگ اپنی بیویوں کو لے کر کبھی کبھار ان سے ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے۔ مگر ظفر اور اس کی بیوی کبھی کسی کے گھر نہ گئے تھے۔ سرکاری دعوتوں کے علاوہ ظفر نے کبھی کسی دعوت میں شرکت نہ کی تھی اور نہ ہی اپنے کسی ہم پیشہ کے ساتھ اس کی دوستی ہوئی تھی۔ وہ کوئی کھیل نہ کھیلتا تھا۔ دفتر کے باہر اس کا تمام تر وقت اپنے گھر میں صرف ہوتا تھا۔ گھر میں وہ دفتر کا کام لے کر آتا، روز کی دو تین اردو اور انگریزی کی اخباریں پڑھتا، شام کو کبھی کبھار اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر پیدل سیر کے لیے جاتا، اور پھر سارا کنبہ کھانا کھانے کے بعد جلد ہی سو جاتا۔

"ان باتوں کا تو ہمیں پہلے سے علم تھا۔" ایاز نے مجھ سے کہا، "کوئی نئی بات بتاؤ۔"

"میں اس کے گاؤں جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا، گویا یہی ایک نئی بات تھی جو میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

جس وقت سے میں واپس لوٹا تھا اسی وقت سے مجھے اپنی ناکامی کا احساس ہونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شروع ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں ایک شخص کی تلاش میں گیا تھا، اور اسے چھوڑ کر کسی اور ہی طرف کو نکل گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان گیارہ دنوں کے سفر کے دوران کسی وقت بھی مجھے یہ احساس نہ ہو پایا تھا کہ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ جب میں شہروں شہر پھر رہا تھا تو اس کام میں اتنا مشغول ہو چکا تھا کہ کسی اور بات کا مجھے خیال نہ رہا تھا، گویا یہ کام میں کسی خاص مقصد کے تحت نہیں بلکہ محض شغل اور دل بہلاوے کے لیے کر رہا تھا۔ اب میں اپنے آپ کو ایک ایسے بے وقوف شخص کی مانند محسوس کر رہا تھا جس کو بچوں کا کوئی دلچسپ کھیل ہاتھ لگ جائے اور وہ دن بھر اسی کھیل میں لگا رہے حتیٰ کہ شام پڑ جائے اور پھر اسے ہوش آئے۔ ایاز کی بات سن کر مجھے اور بھی دکھ ہوا۔ مگر ایاز مذاق کے موڈ میں تھا۔

"بھائی میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم کھوجیوں کی طرح اُٹھ کر نکل پڑو۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ میری بات سنو، مقدمے کا حال پڑھو، اور کوئی بیچ کی ایسی بات بتاؤ جہاں تک ہم فانی لوگوں کی نظر نہ پہنچتی ہو۔" وہ ہنس کر بولا، "یا پھر کوئی کہانی لکھو۔"

"میں اس کے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔" میں نے دوبارہ کہا۔

ایاز نے سنجیدگی سے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "مقدمہ عدالت میں ہے۔" وہ بولا۔ "اب اس میں عدالت کا، ہمارا، پولیس کا، سب کا دخل ہے۔ کوئی باہر کا آدمی اپنے طور پر تفتیش نہیں کر سکتا۔ سب سے پہلے تو پولیس والے تمہیں آ پکڑیں گے۔"

اس ساری شام کو میں ایک گہری ناامیدی کی حالت میں رہا۔ میں چاہتا تھا کہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دوں، باتیں کروں، اپنی مسافت کی تھکن اتار دوں۔ مگر یہ واقعہ میرے دل پہ ایک بوجھ بن کر بیٹھ چکا تھا۔ ایاز چہچہا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس مقدمے کی گرفت سے نکل چکا ہے۔ یوں بھی جتنی پریکٹس ایاز کی تھی اس لحاظ سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی ایک مقدمے کو چند دن سے زیادہ اپنے ذہن پہ سوار رکھے گا۔ ایاز اور نسیم مجھے ایک سکینڈل کی روداد سنا رہے تھے، جس میں ہمارے علاقے کا ایک مشہور سیاست دان ایک عورت کے ساتھ ملوث تھا۔ یہ واقعہ چند روز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے ایک مقدمے کی شکل میں منظرِ عام پر آیا تھا اور نسیم کے بھائی اظہر کے ہاتھ میں تھا۔ میں بے خیالی سے ان کی باتیں سنتا اور ہنستا رہا، مگر اب ایک اور بات مجھے ستائے جا رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آ رہا تھا کہ آخر کس وجہ سے ایاز نے یہ مقدمہ لیا تھا۔ پہلے کبھی مجھے اس بات کا خیال نہ آیا تھا۔ مگر اب جب کہ میرے ذہن کی حالت ایسی تھی کہ ہر قسم کے الٹے سیدھے خیال چلے آ رہے تھے، میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر دیکھا جائے تو اس مقدمے میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ایاز اسے لڑنے پر تیار ہوتا۔ ان دنوں ایاز کی پریکٹس کا معمول تھا کہ یا تو وہ ایسے سیدھے سیدھے مقدمے لیتا تھا جن کی بڑی بھاری فیس پیش کی جاتی ہو، یا پھر وہ مقدمے ہوتے تھے جن میں پیسہ نہ ہوتا تھا مگر جنہیں وہ کسی اخلاقی اصول پر لڑتا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بات اس مقدمے میں موجود نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس مقدمے کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ ایاز اسے جیت کر اپنی شہرت اور مقبولیت کو کسی صورت آگے بڑھا سکتا ہو۔ ان باتوں کے باوجود میں سوچ رہا تھا، صرف یہی نہ تھا کہ اس نے یہ مقدمہ لیا بلکہ تھوڑی دیر کے لیے اسے اپنے ذہن پر سوار کر لیا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

کھانا کھانے کے بعد میری حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ہم تینوں کچھ دیر تک کھانے کی میز پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نسیم دلچسپی کے ساتھ مجھ سے میرے سفر کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کس طرح میں اپنی عمر میں پہلی بار ایک ایسی مہم پہ نکل کھڑا ہوا تھا جس کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا، کس طور پہ میں نے اسے مکمل کیا اور اس وقت میں نے کیسا محسوس کیا جب میں ایک ایسے کام میں لگا تھا جو صرف قصے اور کہانیوں میں پڑھا جاتا ہے۔ نسیم میں یہ ایک غیر معمولی خاصیت تھی کہ وہ کسی بھی حالت میں، کسی بھی آدمی کو اپنی باتوں کی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔ چنانچہ میں نے پہلی بار تفصیل کے ساتھ اسے اپنے گیارہ دنوں کی روداد سنائی۔ وہ آنکھیں پھیلا کر اشتیاق سے میری کہانی سنتی رہی، اور ایاز میرے "معرکوں" پر ہنستا رہا۔ اس دوران میں جو دو ایک بار مقدمے کا براہِ راست ذکر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ نسیم کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمدردی اب قطعی طور پر ظفر کے ساتھ ہو چکی تھی، اور اس نے ظفر کو اپنی بیوی کے قتل پہ ملزم ٹھہرانا چھوڑ دیا تھا، گویا اس کے ذہن میں دو مختلف جذبوں کا تصادم اب رک چکا تھا۔ اپنا قصہ ختم کرنے کے بعد میں نے بہت سا بوجھ اپنے دل سے اترتا ہوا محسوس کیا۔ ہم شب بخیر کہہ کر سونے کو چلے گئے۔

مگر صبح کے وقت دفتر جانے سے پہلے ایاز نے ایک سوال کر کے مجھے چونکا دیا۔

"تم واقعی ظفر کے گاؤں جانا چاہتے ہو؟" اس نے اس طرح مجھ سے پوچھا جیسے میرے ارادے سے نیم متفق ہو۔

"ہاں"۔ میں نے جواب دیا۔

"تو پھر میں تمہیں دو خط لکھ کر دیتا ہوں"۔ وہ بولا۔ "انہیں ساتھ لے جانا"۔

میں نے ایاز سے کہا کہ میں سہ پہر کے وقت آ کر دفتر سے خط لے لوں گا، کیونکہ میں اسی روز واپس اپنے گھر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ سہ پہر کو میں ایاز کے دفتر پہنچا۔ ایاز اپنے دفتر میں نہیں تھا۔ اس کے کلرک سے میں نے اپنے دو خط وصول کیے اور اپنے گھر جانے کو بس کے اڈے کی طرف چل پڑا۔ میں دل میں ظفر کی تبدیلیِ ذہن پہ حیران تھا۔ مگر اس وقت میرے دل میں ایک ہی خیال تھا، کہ کس طرح جلد از جلد ظفر کے گاؤں پہنچوں۔ ایک رات میں نے اپنے گھر پہ بسر کی، گھر پہ کچھ کام رکے ہوئے تھے۔ انہیں نبٹاتے ہوئے سارا دن نکل گیا۔ چنانچہ میں نے سفر کا ارادہ اگلے روز پہ ملتوی کر دیا۔ اگلے روز صبح سویرے میں ریل پہ سوار ہو کر ظفر کے گاؤں کو روانہ ہوا۔

گجرات کے سٹیشن پہ میں نے گاڑی چھوڑ دی۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پہ ان کا گاؤں تھا۔ پکی سڑک گاؤں تک جاتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے تانگے کے سفر کے بعد میں گاؤں پہنچا۔ میرے پاس جو دو خط تھے ان میں سے ایک اردو میں لکھا ہوا ظفر کے باپ کے نام تعارفی خط تھا۔ دوسرا ایاز کے دفتر سے جاری کیا گیا ٹائپ اور مہر شدہ خط تھا جس کے اندر گول مول قانونی زبان میں لکھا گیا تھا کہ مجھے ایاز کی جانب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اختیار حاصل ہے کہ میں اس مقدمے کے سلسلے میں کچھ معلومات اکٹھی کر سکتا ہوں۔
(یہ خط مجھ کو سنبھال کر اپنے پاس رکھنا تھا اور صرف اس صورت میں استعمال کرنا تھا
جبکہ اس کے سوا چارہ نہ ہو۔ خوش قسمتی سے اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی)
ظفر کے باپ نے اپنے داماد کو بلا بھیجا جو اسی گاؤں کے سکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس
کے داماد نے ظفر کے باپ کو خط پڑھ کر سنایا۔ ظفر کے باپ کا نام میاں محمد تھا۔ خط
کا مضمون سننے کے بعد اس نے مجھے اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی۔ کچھ دیر تک
میں اور میاں محمد دھوپ میں ایک چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر میاں محمد
اٹھ کر میری خاطر مدارات میں مصروف ہو گیا۔

میرے دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے ملک میں جو لوگ سرکاری نوکری، تجارت،
تعلیم، یا فنون کے میدان میں نام پیدا کرتے ہیں ان کی اکثریت چھوٹے شہروں اور ان
کے قرب و جوار کے گاؤں سے تعلق رکھتی ہے، اور اقلیت بڑے بڑے شہروں
یا اندرونِ ملک کے دیہات سے آتی ہے۔ (سوائے سیاست اور فوج کے شعبے
کے، جن کے لیڈر اور اعلیٰ افسر عموماً اندرونِ ملک کے دیہات سے، یا پھر بڑے شہروں
سے نکلتے ہیں۔ گو ماحول کے اعتبار سے یہ دونوں علاقے ایک دوسرے کے متضاد
ہیں، مگر غالباً ان میں کچھ ایسے اجزائے مشترکہ پائے جاتے ہیں جو قدرتی طور پر ایک
بے قلب طرزِ زندگی کو موافق آتے ہیں۔) ظفر کا گاؤں اس "درمیانی علاقے" کا گاؤں تھا۔
یہ ایک چھوٹے شہر کے قریب اور جرنیلی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ ایسے دیہات
کا ماحول عموماً دور دراز کے گاؤں کی نسبت مختلف ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے روزمرہ
کاروبار میں شہر کا دخل بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے یہاں کا عام کسان قدرے خوشحال
اور شہری تہذیب سے قریب ہوتا ہے۔ سیاسی طور پر بھی یہ دیہات زیادہ اہمیت
رکھتے ہیں، چنانچہ اکثر یہاں سکول اور ڈسپنسریاں قائم شدہ ملتی ہیں۔ ظفر نے اپنے
گاؤں کے سکول سے مڈل پاس کیا تھا۔ اس کا باپ میاں محمد ایک معمولی حیثیت کا کسان
تھا۔ کسی زمانے میں ان کے خاندان کے پاس اتنی اراضی تھی کہ ان کی حیثیت درمیانے